ساحرلکھنوی کی قصیدہ نگاری

ڈاکٹر روبینہ رفیق*

Abstract:

Between eighteenth and nineteenth centaury Qaseeda[laudatory poem] has been the most significant, and celebrated form of poetry. Though, under the socio-political effects and transformations Qaseeda went into a low profile. However, this classical form fashioned numerous dimensions of ingenuity by modifying itself accordingly and justified its significance with reference to its inventiveness across the time. In this relation, the contribution of Sahir Lakhnavi is noteworthy in the revival and restoration of Qaseeda. The present article evaluates Sahir Lucknawi's Qaseeda in the same vein.

دنیا کے تیزی سے بدلتے منظر نامے میں اپنی بعض خوب صورت تہذیبی وتخلیقی روایات کے گم ہو جانے کا نوحہ اکثر بلند ہوتا ہے اور بے محل بھی نہیں ہوتا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ گزشتہ تہذیبی جمال کے کچھ زندہ حوالے آج بھی ہماری سماجی اور تخلیقی زندگی کی خوشگواری کا باعث ہیں۔ سیّد قائم مہدی ساحرلکھنوی کا شمار بھی ایسے ہی زندہ حوالوں میں ہوتا ہے جن کی شاعری اور شخصیت معدوم ہوتے تہذیبی جمال کا دلکش مرقع ہیں۔

برصغیر کے معروف علمی خانوادے خاندانِ اجتہاد اور لکھنؤ کی مٹی سے تعلق کی بنا پر ان کی شخصیت میں ایک خاص وقار، رکھ رکھاؤ، وضع داری اور خلوص ومحبت کے ساتھ تہذیبی قدروں کی محافظت کا رنگ نظر آتا ہے۔ ان کی اس نستعلیق شخصیت کا عکس ان کی تخلیقات میں بھی نمایاں ہے۔ اگر چہ ان کی تخلیقی طبع نے نظم ونثر دونوں کو اپنے اظہار کے لیے منتخب کیا لیکن اپنے کلاسیکی مزاج اور طبعی وذہنی رغبتوں کے باوصف ان مخصوص اصناف (مرثیہ، قصیدہ، سلام، منقبت، تاریخ گوئی) سے تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی رشتہ استوار کیا جو ہماری شعری روایت کو تابندگی تو عطا کرتی ہیں لیکن معاصر ادبی منظر نامے میں پچھلی صفوں میں نظر آتی ہیں۔ ساحرؔ نے ان کلاسیکی اصناف کو عصری فکر ومسائل سے ہم

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو واقبالیات، دی اسلامیہ یونی ورسٹی آف بہاول پور

آہنگ کر کے ان کے تخلیقی امکانات کی بازیافت کی ہے۔ اس لیے ان اصناف خصوصاً مرثیہ اور قصیدہ میں کلاسیکیت اور عصری حسیت کا امتزاج انہیں تازہ ذائقہ عطا کرتا ہے۔

قصیدہ اپنی فنی ہیئت کے اعتبار سے پیچیدہ صنف سخن اس لیے بھی ہے کہ اس کے اجزائے ترکیبی (مطلع، تشبیب، گریز، مدح، مدعا/دُعا) ہر موڑ پر خیال و اظہار کے نئے پیرایوں کا تقاضا کرتے ہیں اور ان تقاضوں کو نبھانے کے لیے فکر کی تازگی کے ساتھ زبان و بیان پر قدرت بھی نہایت ضروری ہے اور تخیل کی تازہ کاری، قادر الکلامی کا یہ وصف قدرت نے ساحرؔ کو ودیعت کر رکھا ہے۔ شاید اسی بنا پر ان کی تخلیقی وفور اور جوشِ طبیعت نے اپنے لیے مرثیہ کے ساتھ قصیدہ کی وسیع جولان گاہ کو منتخب کیا جس کا اظہار وہ اپنے ایک قصیدے کی تشبیب میں کرتے ہیں:

شعور شاعری سے طبع کو جب آشنا پایا — مرے شوقِ سخن آرائی نے ذوق ثنا پایا
کیا آغاز جو فکرِ سخن کا ذکر مولا سے — زباں نے روزِ اوّل ہی مدحت کا مزا پایا
تھا میدان منقبت کا مری چشمِ شوق میں لیکن — مرے جوشِ طبیعت نے اسے محدود سا پایا
تھی میری فکر کو درکار جو اِک بحر کی وسعت — قصیدے کو ذریعہ ندرتِ اظہار کا پایا
وہ تشبیب و گریز و مدح کی پرکاریاں اس میں — غزل سے بڑھ کر جن کو دل فریب و دلربا پایا
قصیدے کی یہ منزل گو بہت دشوار تھی مجھ کو — مگر جذبہ کی سچائی سے دل نے حوصلہ پایا
خود اپنے پیر زخمی کر لیے اس راہ میں لیکن — جہاں کانٹے ہی کانٹے تھے وہاں بھی راستہ پایا (۱)

یوں تقریباً ایک معدوم ہوتی صنفِ سخن کو اپنا کر اعتبار دینے کے ساتھ یہ وقار بھی بخشا کہ اس کا موضوعاتی دائرہ درباداری اور دنیاوی جاہ وطلبی کے گرد نہیں بُنا بلکہ اس کو بلندی عطا کرتے ہوئے ذواتِ مقدسہ سے منسوب کر دیا یعنی موضوعاتی لحاظ سے ان کے قصائد، حمدیہ، نعتیہ اور منقبتی ہیں۔ اس نوع کے قصیدے لکھنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں کہ حفظ مراتب کا دھیان رکھنا از بس ضروری ہے۔ ذرا سی لغزش، بے ادبی کا موجب تو ہے ہی فنی اعتبار سے بھی بدنمائی کا باعث بنتی ہے۔ دوسری طرف قصیدہ نگار کو ایک آسانی بہر حال میسر رہتی ہے کہ مقدس ہستیوں کی مدح میں لکھے جانے والے قصائد میں مبالغے کے الزام کے امکانات بھی کم ہو جاتے ہیں کہ خالقِ کائنات، وجہِ تخلیق کائناتؐ اور آئمہ اطہارؑ کی عظمت و رفعت کی حدوں تک انسانی تخیل کو پرواز کی سکت ہی نہیں:

''لہٰذا ان کی مدح میں ان کو بس خدا نہ کہیے اور جو جی چاہے اور جس طرح چاہیے ان کی مدح و ثنا کیجیے۔ اس پر مبالغہ کا اطلاق ہو ہی نہیں سکتا۔''(۲)

ساحرؔ نے سوا سو کے قریب قصائد لکھے لیکن مطبوعہ قصائد کی تعداد اٹھارہ ہے جو ''صحیفۂ مدحت'' کے عنوان

کے تحت کتابی شکل میں ۱۹۹۷ء میں آثار وافکار اکادمی کراچی سے شائع ہوئے۔ان قصائد کا موضوعِ سخن رَبِّ کریم اور محبوبِ رَبِّ کریم کے علاوہ حضرت علیؑ، حضرت فاطمۃ الزہراؑ، حضرت امام حسنؑ، حضرت امام حسینؑ، حضرت زینبؑ، حضرت عباسؑ اور امام مہدیؑ ہیں۔اسی نسبت سے صحیفہ مدحت کے نو حصے ہیں اور ہر حصے کا سرنامہ ایک شعر ہے جو اس حصے کے موضوعِ سخن کی شخصیت و اصاف کی صراحت کرتا ہے۔اس کے علاوہ ان تمام ہستیوں کی ذاتِ مبارکہ کے جن پہلوؤں کو مدح سرائی کا موضوع بنایا ہے انہیں ایک خوب صورت عنوان سے ظاہر کیا ہے۔مثلاً جادۂ حمد، نقشِ اوّل، بارانِ رحمت، قلم، شہرِ آشوب، موت وحیات، موسمِ گل، بہارِ جنت، گلشن مدحت، فصلِ گل وغیرہ۔بعض عنوانات کی تکرار ساحرؔ کے فکری وجذباتی میلانات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔مثال کے طور پر حضرت علیؑ اور حضرت عباسؑ کے دو قصائد کے عنوانات ایک جیسے ہیں یعنی 'شہرِ آشوب' اور 'قلم' ہیں۔'قلم' ان کے فکری میلان کو ظاہر کرتا ہے اور 'شہرِ آشوب' اس جذباتی کیفیت کا عکاس ہے جو ایک بے یقین سماجی صورتِ حال میں سانس لینے (یا گھٹنے) سے پیدا ہوتی ہے۔جذبہ وفکر کا یہ تال میل ان کے قصائد کو انفرادیت عطا کرتا ہے۔

ان قصائد کا موضوعاتی کینوس یوں تو حمد وثنا اور مدحت ومنقبت کے بنیادی رنگوں سے مزین ہے لیکن علم و حکمت اور حلم ومحبت کا کائناتی رسوخ، اعلیٰ ترین انسانی اوصاف کی ہمہ گیر آفاقیت اور عصری مسائل کی گھمبیرتا سے آگہی بھی اس کینوس میں تنوع، وسعت اور گہرائی پیدا کرتے ہیں۔اس تناظر میں ان قصائد کو دو حصوں میں منقسم کیا جاسکتا ہے۔اوّلاً وہ جن میں مدح وثنا اور علم وحکمت کے مضامین محبت وعقیدت اور بصیرت کے چراغ جلاتے ہیں۔ ثانیاً وہ جن میں عصری آشوب اور اس کے نتیجے میں جنم لینے والی ایک نا مختتم گھمبیر اور اندوہ ناک صورتِ حال سے نجات کے لیے ربّ کائنات کی غفور الرحیمی، رحمت اللعالمینؐ کی کرم نوازی اور مولا علیؑ کی مشکل کشائی کی طرف رجوع کیا گیا ہے۔جادۂ حمد، شہرِ آشوب (در مدح علیؑ)، گرانی (در مدح علیؑ)، شہرِ آشوب (در مدح عباسؑ)۔

عصری صورتِ حال کا یہ اندوہ اگرچہ ایک مخصوص زمانی اور مکانی (نوے کی دہائی کا کراچی) پس منظر رکھتا ہے تاہم یہ کتنا کڑوا سچ ہے کہ بے یقین اور وحشت انگیز ساعتوں کا یہ بگولا آج بھی ہمارے چاروں اور رقص کناں ہے۔اس اعتبار سے ان قصائد کی معنویت اور اہمیت کا دائرہ محدود نہیں رہتا۔ساحرؔ نے ان قصائد میں ایک کوچۂ بے اماں کی تصویر کشی کی ہے جس کی ہر اینٹ پر 'الحفیظ والامان' کی خواہش اور دُعا رقم ہے۔ایک ایسا شہر برباد جس کے در و دیوار اور سبزہ وگل اس کے مکینوں کی آتش مزاجی اور سفاکی کی بدولت خون آلود ہیں۔نفرتوں کا زہر رگوں میں اس طرح اُترا ہے کہ محبت، دوستی، خلوص ومروّت سب بھسم ہو کر رہ گئے ہیں۔زندگی موت کے جبڑے میں پھنسی بے بسی سے پھڑ پھڑا رہی ہے۔گلی کوچوں، سڑکوں، شاہراہوں پر انسان نما عفریتوں کے آدم بو آدم بو چلانے کی کریہہ آوازیں خوف اور سناٹے

بورہی ہیں:

رقصِ بسمل کا تماشا ہر گلی کوچہ میں ہے ہر قدم دار و رَسن ہے ہر نفس کرب و بلا
بھوک مٹتی ہی نہیں عفریتِ آدم خور کی ختم ہوتی ہی نہیں دیوِ اجل کی اشتہا
(دردآشوب درمدحِ عباسؑ)

❁❁❁

بھڑک رہی ہے دلوں میں عناد وبغض کی آگ کھڑک رہی ہے ہر اِک گام ظلم کی زنجیر
فرات وقت کا پانی ہے آتش سیال بجائے آب خنک بہہ رہی ہے نار سعید
ہر اِک شے سے گراں عافیت کا اِک لمحہ ہر ایک چیز سے ارزاں ہے قاتلوں کا ضمیر

اس بدقسمتی میں اضافہ بعض طالع آزماؤں کی ہوس اختیارواقتدار بھی کرتی ہے اوران طالع آزماؤں میں 'شیخ وبرہمن' اور 'واعظ ومحتسب' سب شامل ہیں:

ہیں لہو میں ہاتھ ڈوبے منصفانِ وقت کے
خونِ ناحق سے ہے رنگین مفتی دیں کی قبا

❁❁❁

زبان سے کہتے ہیں لا تفسدو فی الارض عمل سے کرتے ہیں الٹی کتاب کی تفسیر
ہر ایک کی آنکھ کا تنکا تلاش کرتے ہیں جو دیکھ سکتے نہیں اپنی آنکھ کا شہتیر

بے کرداری، ریاکاری، بے لیاقتی اور فتویٰ فروشی کا یہ عمل دکھ اور تلخی بن کر ساحرؔ کے دل میں اُترتا ہے اور سوال بن کر بارگاہِ ایزدی میں کھڑا ہوجاتا ہے:

تو نے احسنِ تقویم کی دی اس کو سند
ہوگیا کیوں یہ سگ وخوک سے بڑھ کر ارزل

یہ دکھ کبھی کبھی ساحرؔ کے لہجے میں تلخی بلکہ زہرخند کی کیفیت پیدا کردیتا ہے:

اس قدر ظلم وستم کا اس قدر سادہ جواز عشق میں اور جنگ میں ہر بات ہوتی ہے روا
یہ ستم کیشی یہ خوں ریزی یہ فتنہ و جنوں مرحبا اے پیرو خلقِ محمد، مرحبا

تضاد، ریاکاری، عدم برداشت، جبروستم کے سیاہ دھوئیں ذہن ودل کو آلودہ کرنے پر آمادہ ہوں تو ساحرؔ کے قصیدوں کا دریچہ ایک ایسے منظر پہ کھلتا ہے:

قدم رکھتے ہی جہاں ، نئی دنیا میں جا پہنچا جہاں ذرّے ملاتے ہیں نظر خورشید خاور سے
چمن میں ہر طرف رنگِ بہاراں پھوٹ نکلا ہے شجر سے، برگ سے، سبزے سے، شبنم سے، گلِ تر سے

تقدیس وتطہیر، رنگ ونور سے معمور یہ معطر دنیا ذہن و دل کی آلودہ ہوتی فضاؤں کو نکھار دیتی ہے اور انسانیت پر سے مرجھاتے یقین کو ہرا بھرا اور شاداب کر دیتی ہے یعنی ذواتِ مطہرہ کی شان میں لکھے گئے قصائد میں ان اعلیٰ ترین انسانی اوصاف کو موضوعِ سخن بنایا گیا ہے جو آج کے انسان میں سے منہا ہوتے جا رہے ہیں یعنی پاکیزہ نفسی، تقدیسِ کردار، تطہیرِ خیال، حوصلۂ حق گوئی، وفا شعاری، عدل پسندی، تخلیقی سوچ اور صبر وتحمل۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ہر دو طرح کے قصائد معنوی اعتبار سے آج کے انسان کے انفرادی اور اجتماعی خسارے کے دکھ کو بیان کرتے ہیں۔

موضوعاتی تنوع کے ساتھ ساحرؔ کے یہاں قصیدے کی فنی جمالیات کا احساس بھی پورے طور پر نمایاں ہوتا ہے۔ قصیدے کے تمام فنی پیچ وخم (مطلع، تشبیب، گریز، مدح اور مدعا) تجربات کے تنوع سمیت ان کی فن کارانہ دسترس میں نظر آتے ہیں۔ انہوں نے زیادہ تر قصائد مشبّب لکھے ہیں لیکن تشبیب سے پہلے مطلع کی ندرت، جاذبیت اور معنویت پر بھی گہری نگاہ رکھی ہے۔ اس لیے ان کے قصائد کے مطلعے موضوعاتی اور فنی تناظر میں معنی آفرینی، حسن کاری اور تدبیر کاری کا دل کش نمونہ ہیں۔ مثال کے طور پر نعتیہ قصیدہ، نقشِ اوّل کا مطلع دیکھئے:

تھی پسِ پردہ تخلیق ابھی صبحِ ازل
ہُو کا عالم تھا گلشن تھے نہ صحرا نہ جبل

یہ مطلع اس گھنی چپ، بے کراں تاریکی اور اَن حد سناٹے کی مکمل تصویر کشی کرتا ہے جو کائنات کی ہما ہمی سے پہلے موجود تھی اور یہ خاص کیفیت قاری کی حسیات کو پورے طور پر گرفت میں لے لیتی ہے۔ اسی طرح گرانی (در مدح حضرت علیؑ) کے مطلع میں بھی ایک ایسی پہلو دار اور آفاقی صداقت مسکرا رہی ہے جو ظاہر میں بھی جلوہ فرما ہے اور باطن میں بھی۔

ازل سے فطرتِ انساں حسن پر تھی نثار
ہمارے کعبۂ دل پہ بتوں کی تھی یلغار

انسان کی تخلیق حسنِ ازل کی اپنے آپ کو دیکھنے کی خواہش کا نتیجہ ہے۔ یوں اس کی فطرت میں حسن پرستی کا عنصر شامل ہے۔ دل حسن طلبی کا مرکز ہے اور وہ مقدس مقام جو شہ رگ سے قریب تر ہے اس لیے کعبۂ دل کی ترکیب معنی خیز بھی ہے اور مناسب ترین بھی کہ اہلِ نظر و دل جانتے ہیں کہ خدا کا اصلی گھر انسان کا دل ہے۔

اسی طرح تشبیب کے مرحلے پر بھی ان کی جدت وجودتِ طبع نے ندرتِ خیال اور قدرتِ زبان کے کئی

خوب صورت نمونے پیش کیے ہیں۔ تشبیب کے اعتبار سے قصیدہ عام طور پر بہاریہ، عشقیہ، حالیہ، فخریہ یا پھر دُعائیہ ہوتا ہے۔ ساحرؔ کی بیشتر تشبیبیں بہاریہ یا حالیہ ہیں۔ بہاریہ تشبیب میں وہ ایسا عطر بیز اور مقدس ماحول تخلیق کرتے ہیں جہاں حسن ہی حسن ہے، رنگ ہی رنگ ہے اور شادابی ہی شادابی جب کہ حالیہ تشبیب میں اپنے عہد کی سفاک حقیقتوں کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ لفظ خون میں نہا جاتے ہیں۔ ساحرؔ نے بعض قصائد میں ان کے علاوہ بھی ایسے انوکھے تخیلاتی زاویے تخلیق کیے ہیں جو مسحور کر دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر 'نقشِ اوّل' کی ہی تشبیب دیکھئے:

نہ مہ و مہر کے فانوس نہ تاروں کے چراغ — نہ کوئی شمع فروزاں نہ کہیں جھاڑ کنول
نہ اُجالا نہ اندھیرا نہ سحر اور نہ شام — نہ حرارت نہ برودت نہ حیات اور نہ اجل
نہ کہیں دشتِ جنوں کی اُڑتی ہوئی خاک — نہ کہیں بچھی ہوئی سبزۂ نو کی مخمل
وقت ایسا کہ کوئی وقت کا پیمانہ نہیں — کوئی ساعت نہ کوئی پَل نہ کوئی آج نہ کل
منظر ایسا کہ حدِ چشمِ تصور میں نہیں — وہ سماں جو نگہہ وہم و گماں سے اوجھل

یہ تشبیب ایک اعتبار سے منظریہ کہلائی جاسکتی ہے جس میں اس گھن گھور اندھیرے اور بے پناہ خاموشی کو مصور کیا گیا ہے جو تخلیقِ کائنات سے پہلے تھی۔ انوکھا پن اس منظر میں یہ ہے کہ ہونے نہ ہونے کی کیفیت ہے۔

ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

کے مصداق کائنات کے مظاہر کی نیرنگیوں اور زندگی کی ہماہمی کی مکمل تصویر بنتی بھی ہے اور مٹتی بھی ہے۔ یوں کہیے کہ قمقموں کے جل بجھنے کا ایک مسلسل منظر ہے جو کبھی روشن ہوتا ہے اور کبھی معدوم۔

اسی طرح شہرِ آشوب (در مدحِ عباسؑ) کی تشبیب میں بھی یہی ندرت ہے۔ اس میں سارے تلازمات بہار کے ہیں لیکن کیفیت متضاد۔ گلشن ہے تو اُجڑا ہوا، پھول ہیں تو مَسلے ہوئے، سبزہ ہے تو پامال:

فصلِ گل میں وہ خزاں کا دور دورہ ہے کہ بس — پھول ہیں مَسلے ہوئے سبزہ ہے پامالِ جفا
دامنِ گل پر ہے شبنم مثلِ اشکِ چشمِ تر — نالہ و ماتم کی لے ہے بلبلوں کا چہچہا

ساحرؔ تشبیب سے گریز کا موڑ مڑتے ہوئے مدح کے باب میں اتنی خوب صورتی سے داخل ہوتے ہیں کہ بے اختیار زبان سے واہ کی صدا بلند ہوتی ہے۔ مدح قصیدے کا وہ جز ہے جہاں عقیدت و محبت ایسے پُرجلال اور پُرشکوہ منظر اور کیفیات تخلیق کرتی ہے جو قاری کو باطنی طور پر بھی علویت اور ترفع کی اُس منزل سے ہمکنار کرتی ہے جو مادی دنیا کے گرداب میں پھنس کر عام طور پر اس کی نظروں سے اوجھل رہتی ہے۔ ساحرؔ کے قصائد میں بھی مدح کا جلوہ جلال و جمال، شکوہ و ترفع اور حسن و شوق کا مظہر ہے۔ فنی اعتبار سے بھی اس حصے میں انہوں نے کئی دل کش تجربے کیے ہیں۔ گرانی میں

گریز اور مدح میں تکرار کے رنگ نے عجب طرح کی خوشگواریت پیدا کی ہے۔یعنی اس قصیدے میں گریز کا مرحلہ دو مرتبہ آیا ہے۔پہلی مرتبہ قیمتِ دل کے بڑھ جانے کے پس منظر میں گرانی کے حوالے سے (شعرنمبر۸،۹) اور دوسری مرتبہ گرانی سے گھبرا کر مشکل کشا سے طالبِ نجات ہونے کی خواہش کے پس منظر میں (شعرنمبر۴۹،۵۰) اسی مقام سے مدح کا دروازہ کھلتا ہے۔مدح کے حوالے سے بھی یہ قصیدہ ایک دلفریب ندرت کا حامل ہے۔ساحرؔ نے مدح علیؑ تین مختلف طریقوں سے کی ہے (اور اسی تناظر میں مطلع نو بھی تخلیق کیے ہیں) مدح اوّل 'ہاتف غیب' کی زبانی بیان کی گئی جس میں مولا علیؑ کی مشکل کشائی کو زندگی کے ہر پہلو سے جوڑ دیا ہے لیکن اس طرح کہ تشبیب، استعارہ، تلمیح سب ایک قطار میں سر جھکائے اِن اشعار میں آتے چلے جاتے ہیں:

جو مبتلائے مصائب میں ہو تو علیؑ کو پکار — یہ وہ ہیں حورِ سلیماں کی سنتے ہیں جو پکار
یہ نام لے کے جو سیلِ بلا میں کود پڑے — جو مثلِ حضرتِ موسیٰ ہو اُس کا بیڑا پار
ہوں داد خواہ اگر ان سے یوسفانِ چمن — تو چاکِ دامنِ گل خود سیے گی سوزنِ خار

مدح کا دوسرا رنگ بزبانِ شاعر مدح علیؑ میں لفظوں کے گل وگلزار کھلاتا ہے۔شاعر کی عقیدت عشق کی حدوں کو چھوتی ہے حتیٰ کہ حب علیؑ کی سرشاری میں وہ ایسی باتیں بھی کہہ گئے ہیں جو عشق کی شریعت میں تو قابلِ گرفت نہیں لیکن دیگر مسالک کے حوالے سے شاید اختلافی ہوں۔

مدح علی کا تیسرا رنگ 'مدحِ حاضر' ہے یعنی وہ رنگ جو حاضری اور حضوری کی کیفیت کا ترجمان ہے۔ حضرت علیؑ کو مخاطب کر کے اُن کی عظمت وسربلندی کا اعتراف نہایت احترام ومحبت کے ساتھ کیا گیا ہے:

ہے تو ہی سرورِ اقلیمِ وسعتِ کونین — شہ شہپر سریر و خدیو عرش وقار
سحابِ رحمتِ پروردگار چشمِ کرم — مثالِ چشمۂ آیات ہے لبِ گفتار

فنی اعتبار سے یہ قصیدہ بہت خوب صورت ہے کہ اس میں بنیادی اجزاء کی تکرار اُس موسیقی سے مشابہہ ہے جس میں ایک گائیک شعر کو کئی راگوں میں ادا کرتا ہے۔

طولانی قصائد کے علاوہ ساحرؔ نے مختصر ترین یعنی محض تین اشعار پر مبنی قصائد (غیر مطبوعہ) لکھ کر قصیدہ گوئی میں ہیئتی تجربے کیے ہیں۔ان قصیدوں کے اختصار میں فنِ قصیدہ کے تمام جلوے نظر آتے ہیں۔تشبیب، گریز اور مدح سب موجود ہیں۔مثال کے طور پر حضرت عباسؑ کی مدح میں لکھا گیا قصیدہ دیکھئے:

چمن کے لب پہ جو فصلِ بہاراں میں دُعا آئی — تو اِک غنچہ نے لی اِک شاخ کی گودی میں انگڑائی
اسی مطلع کی ضو سے مطلعِ نو ہو گیا روشن — اسی تشبیب نے کی ذوقِ مدحت کی پذیرائی

جو تاریخِ وفا خونِ بنی ہاشم نے دہرائی ''ابوطالب نے لی عباس کے پیکر میں انگڑائی

جس ندرتِ فکر، جدتِ مضمون، شکوہ الفاظ، معنی آفرینی اور بیان کے رکھ رکھاؤ، دل پذیری اور دل کشی کا طلب گار ہے۔ لکھنؤ سے تعلق رکھنے والے ساحؔر کی سحر انگیز زبان اور جادو اثر بیان نے وہ سب تقاضے پورے کیے ہیں۔ ان کے تصرف میں الفاظ کا ایک وسیع ذخیرہ ہے جس سے وہ موقع محل کی مناسبت سے بڑی بے ساختگی، بے تکلفی اور روانی سے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ موت و حیات میں زندگی اور موت کا مسلسل تقابل کرتے ہوئے انہوں نے فصاحت کے دریا بہا دیئے ہیں۔ استعاروں کی وہ فضا تخلیق کی ہے کہ پڑھنے والا حیرت سے

؎ میں دیکھتا چلا گیا

کی عملی تفسیر بن جاتا ہے۔ ایک ایک کیفیت کو بیان کرنے کے لیے لفظ گویا اُن کے قلم کے اشارے کے منتظر ہیں:

وہ ماتم، سوگواری، رنج، وحشت، خانہ ویرانی	یہ نغمہ، لَے، ترنم، رنگ، نکہت، حُسن زیبائی
وہ نوحہ، سوز، نالہ، غم، الم، فریاد، بے تابی	یہ پائل، چنگ، دف، پازیب، گھنگھرو، طبلِ شہنائی
وہ بے ہوشی، سکوتِ عقل، غفلت، خود فراموشی	یہ بینائی، بصیرت، فہم، دانش، علم، دانائی

ساحؔر کا محاکاتی اسلوب واقعہ و جذبہ کی ایسی خوش رنگ تصویریں تخلیق کرتا ہے جن میں عقیدت و محبت کا جادوئی لمحہ جان ڈال دیتا ہے۔ جذب و کیف اور حسن و شوق کا ایک نرالا عالم تخلیق ہوتا ہے جو عشقِ خاص کا عطیہ ہے۔ یہ کیفیت ساحر کے ہاں ایسے جھومتے، گاتے اور رقص کرتے لفظوں اور استعاروں میں یوں بیان ہوتی ہے کہ پورا عالم وجد میں دکھائی دیتا ہے۔ حسن و جمال کی کیف آفریں لہریں ظاہر سے باطن تک سفر کرتی ہیں اور یہ استعارے محض استعارے نہیں رہتے بلکہ تمثالوں کا درجہ اختیار کر لیتے ہیں:

گنگناتی لہو کی بوندوں کی وہ رِم جھم رِم جھم	جیسے گھنگھرو ہوں کسی پاؤں میں چھم چھم چھم چھم
مشتری رقص کناں ہو سرِ محفل جیسے	جیسے ناہید نے چھیڑی ہو فلک پر سرگم
گھٹتی بڑھتی ہوئی بارش میں سُرو کی لذت	کوئی اُتم، کوئی پنچم، کوئی کومل، کوئی مدھم

تشبیہ، تلمیح اور استعاروں کے ساتھ وضع تراکیب میں بھی ان کے شاعرانہ تخیل اور قدرتِ کلام نے اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ یہ تراکیب طویل اور خوش نما بھی ہیں اور مختصر و دیدہ زیب بھی۔

مثالِ چشمِ آیاتِ حق، سحابِ رحمتِ پروردگار
سرخیٔ لبِ لعلیں سلمائے زندگی بارشِ کرمِ اہلِ زر

مولانا باقر شمس آغا ان کے اسلوب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ساحر صاحب کے قصیدوں کے اکثر و بیشتر اشعار پُر شکوہ الفاظ اور ان کی دل کش ترکیبوں سے آراستہ، حشو و زوائد سے پاک، برمحل، پُر لطف صنائع بدائع سے مرصع، برجستہ محاوروں اور بے ساختہ روزمرہ کے استعمال سے بامزہ، جا بجا تلمیحات اور نادر تشبیہات سے مزین ساتھ ہی ساتھ شستہ اور شائستہ زبان کی شیرینی و چاشنی باعثِ لطف ولذتِ سخن پھر ایسے میں کیوں نہ یاد آنے لگیں مرزا سودا جیسے استادانِ سخن اور عزیز لکھنوی جیسے صاحبانِ فن۔''(۳)

مختصراً یہ کہ ساحرؔ کے یہ قصائد ایمان وایقان اور عقیدے وعقیدت کے اظہار کے ساتھ اس اخلاص اور محبت کے مظہر بھی ہیں جو اندیشہ ناک سیاسی وسماجی صورتِ حال کے گرداب میں پھنسے بے بس لوگوں کی نجات کے لیے آسمانی قوتوں اور مقدس ہستیوں کی طرف رجوع کرتی ہے۔

❁❁❁

حوالہ جات

۱۔ ساحرلکھنوی، قصیدہ عربی سے اُردو تک، مشمولہ صحیفۂ مدحت، کراچی: آثار وافکار اکادمی، ۱۹۹۷ء، ص ۵۷

۲۔ ایضاً، ص ۴۷

۳۔ باقر شمس آغا، مولانا، ساحر کا شاعرانہ مرتبہ، مشمولہ خانوادۂ اجتہاد کے مرثیہ گو (ماحر سے ساحر تک)، کراچی: آثار وافکار اکادمی، ۲۰۰۳ء، ص ۲۳۷